کوڑی بھی کسی کو ہجم نہیں ہوسکتی ۔ چاہے کتنا ہی چورن کھائے ۔ میں تو سرط بند کر کہتا ہوں کہ اس کے گھر کی تلاشی لے جائے تو مال برآمد ہو جائے ۔

دوسرے روز منہ اندھیرے بھیرو نے کوتوالی میں اطلاع کی ۔ دوپہر تک داروغہ جی تفتیش کرنے کے لیے آ پہنچے ۔ جگدھر کی خانہ تلاشی ہوئی ۔ بھیرو نے سمجھا، اس نے مال کہیں چھپا دیا ۔ اس دن سے بھیرو کے سر ایک بھوت سا سوار ہو گیا ۔ وہ سویرے ہی داروغہ جی کے گھر پہنچ جاتا ۔ تمام دن ان کی خدمت کیا کرتا ۔ چلم بھرتا، پیر دباتا، گھوڑے کے لیے گھاس چھیل لاتا ۔ تھانہ کے چوکی داروں کی خوشامد کرتا ۔ اپنی دکان پر بیٹھا ہوا تمام دن اسی چوری کا تذکرہ کیا کرتا ۔ کیا کہوں مجھے کبھی ایسی نیند نہ آتی تھی ۔ اس دن نہ جانے کیسے سو گیا مگر بندھوا نہ دوں تو نام نہیں ۔ دروگا جی تاک میں ہیں ۔ اس میں سب روپے ہی نہیں اشرفیاں بھی ہیں ۔ جہاں بکیں گی بیچنے والا پھورن پکڑا جائے گا ۔

رفتہ رفتہ بھیرو کو سارے محلّہ پر شبہ ہونے لگا اور جلتے تو لوگ اس سے پہلے ہی تھے ۔ اب سارا محلّہ اس کا دشمن ہو گیا ۔ یہاں تک کہ آخیر میں وہ اپنے گھر والوں پر ہی اپنا غصہ اتارنے لگا ۔ سبھاگی پر پھر مار پڑنے لگی ۔ تو نے ہی مجھے چوپٹ کیا تو اتنی بے خبر نہ سوتی تو چور کیسے گھر میں گھس آتا ۔ میں دن بھر دوری دکان کرتا ہوں ۔ تھک کر آتا ہوں ۔ تو گھر میں پڑے پڑے کیا کیا کرتی ہے ۔ اب جہاں سے بنے میرے روپے لا نہیں تو جیتا نہیں چھوڑوں گا ۔

اب تک اس نے اپنی ماں کا ہمیشہ ادب کیا تھا ۔ پر اب اس کو بھی لے دے کرتا ۔ ’تو کہا کرتی ہے کہ مجھے رات میں نیند ہی نہیں آتی ۔ ساری رات جاگتی رہتی ہوں ۔ اس دن تجھے کیسے نیند آ گئی؟‘‘ خلاصہ یہ کہ اس کے دل میں کسی کی عزت، کسی کا اعتبار، کسی کی محبت نہ رہی ۔ روپے کے ساتھ ہی اخلاق بھی اس سے یک دم رخصت ہو گیا ۔ جگدھر کو دیکھ کر تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا ۔ اسے بار بار چھیڑتا کہ

کسی طرح گرم پڑے تو اس کی خبر لوں لیکن جگدھر اس سے بچتا رہتا تھا۔ وہ کھلی چوٹیں کرنے کی بہ نسبت چھپی چوٹیں کرنے میں زیادہ ہوشیار تھا۔

ایک روز شام کے وقت جگدھر طاہر علی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ طاہر علی نے پوچھا۔ ''کیسے چلے جی؟''

جگدھر: آپ سے ایک بات کہنے آیا ہوں۔ آبکاری کے داروغا ابھی مجھ سے ملے تھے۔ پوچھتے تھے بھیرو گدام پر دکان رکھتا ہے کہ نہیں؟ میں نے کہا۔ صاحب مجھے نہیں معلوم۔ تب چلے گئے پر آج کل میں وہ اس کی جانچ کرنے جرور آئیں گے۔ میں نے سوچا کہیں آپ کی بھی سکایت نہ کر دیں۔ اس لیے دوڑا آیا ہوں۔

طاہر علی نے دوسرے ہی روز بھیرو کو وہاں سے بھگا دیا۔

اس کے کئی روز بعد ایک روز رات کے وقت سورداس بیٹھا کھانا پکا رہا تھا کہ جگدھر نے آ کر کہا۔ ''کیوں سورداس تمہاری امانت تو تمہیں مل گئی نا؟''

سورداس نے تجاہل سے کہا۔ ''کیسی امانت؟''

جگدھر: وہی روپے جو تمہاری جھونپڑی سے اٹھ گئے تھے۔

سورداس: میرے پاس روپے کہاں تھے؟

جگدھر: اب مجھ سے نہ اڑو۔ رتی رتی بات جانتا ہوں اور خوس ہوں کہ کسی طرح تمہاری پچ (چیز) اس پاپی کے چنگل سے نکل آئی۔ سوبھاگی اپنی بات کی پکی ہے۔

سورداس: جگدھر! مجھے اس جھمیلے میں نہ گھسیٹو۔ گریب آدمی ہوں۔ بھیرو کے کان میں جرا بھی بھنک پڑ گئی تو میری جان تو پیچھے لے گا۔ پہلے سوبھاگی کا گلا گھونٹ دے گا۔

جگدھر: میں اس سے کہنے تھوڑے ہی جاتا ہوں۔ پر بات ہوئی میرے من کی۔ بچہ نے اتنے دنوں تک حلوائی کی دکان پر کھوب دادے کا پھاتحہ پڑھا۔ دھرتی پر پاؤں ہی نہ رکھتا تھا۔ اب ہوس ٹھکانے آ جائیں گے۔

سورداس: تم ناحق میری جان کے پیچھے پڑے ہو۔

جگدھر: ایک بار کھل کھلا کر ہنس دو تو میں چلا جاؤں۔ اپنی گئی ہوئی چیج پا کر لوگ پھولے نہیں سماتے۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو ناچتا، کودتا، گاتا، بجاتا تھوڑی دیر کے لیے پاگل ہو جاتا۔ اتنا ہنستا اتنا ہنستا کہ پیٹ میں باؤ گولا پڑ جاتا اور تم سونٹھ بنے بیٹھے ہو۔ لو۔ ہنسو تو۔

سورداس: اس بکھت ہنسی نہیں آتی۔

جگدھر: ہنسی کیوں نہ آئے گی۔ میں تو ہنسا دوں گا۔

یہ کہہ کر اس نے سورداس کو گدگدانا شروع کیا۔ سورداس زندہ دل آدمی تھا۔ قہقہے مارنے لگا۔ حاسدانہ خوش طبعی کا عجب نظارہ تھا۔ دونوں تھیٹر کے نقالوں کی طرح ہنس رہے تھے اور یہ خبر نہ تھی کہ ہنسی کا انجام کیا ہوگا۔ شامت کی ماری سوبھاگی اسی وقت بنیے کی دکان سے جنس لیے ہوئے آ رہی تھی۔ سورداس کے گھر میں بڑے زور کے قہقہے کی آواز سنی تو تعجب ہوا کہ اندھے کنوئیں میں پانی کیسا۔ آ کر دروازہ پر کھڑی ہوگئی اور سورداس سے بولی۔ ''آج کیا مل گیا سورداس جو پھولے نہیں سماتے؟''

سورداس نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔ ''میری تھیلی مل گئی۔ چور کے گھر میں چھچھور بیٹھا۔''

سوبھاگی: تو سب مال اکیلے ہضم کر جاؤ گے؟

سورداس: نہیں تجھے ایک کنٹھی لا کر دوں گا۔ ٹھاکر جی کا بھجن کرنا۔

سوبھاگی: اپنی کنٹھی دھر رکھو۔ مجھے ایک سونے کا کنٹھا بنوا دینا۔

اس پر تینوں نے قہقہہ مارا۔ اتفاقاً بھیرو بھی اسی وقت تھانہ سے چلا آ رہا تھا۔ قہقہے کی آواز سن کر اس نے جھونپڑی کے اندر جھانکا۔ یہ آج کیسے گل چھرے اڑا رہے ہیں؟ یہ تگڈم دیکھا تو آنکھوں میں خون اتر آیا جیسے کسی نے کلیجہ پر گرم لوہا رکھ دیا ہو۔ غصہ سے پاگل ہوگیا۔ سخت سے سخت فحش سے فحش الفاظ کہے جیسے کوئی سورما اپنی جان

بچانے کے لیے اپنے حربہ کا مہلک ترین استعمال کرے۔ ''تو بدچلن ہے۔ میرے دشمنوں کے ساتھ ہنستی ہے۔ فاحشہ کہیں کی۔ ٹکے ٹکے پر اپنی آبرو بیچتی ہے۔ خبردار جو آج سے میرے گھر میں کدم رکھا۔ خون چوس لوں گا۔ اگر اپنی کسل چاہتی ہے تو اس اندھے سے کہہ دے پھر مجھے اپنی صورت نہ دکھائے نہیں تو اس کی اور تیری گردن ایک ہی گنڈاسے سے کاٹوں گا۔ میں تو ادھر ادھر مارا مارا پھروں اور یہ کل منہی یاروں کے ساتھ نوک جھونک کرے۔ پاپی اندھے کو موت بھی نہیں آتی کہ محلّہ صاف ہو جائے۔ نہ جانے اس کے کرم میں کیا کیا دکھ بھوگنا لکھا ہے۔ شاید جیل میں چکی پیس کر مرے گا۔''

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ سوبھاگی کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ معلوم ہوا سر پر بجلی گر پڑی۔ جگدھر خوش ہو رہا تھا جیسے کوئی شکاری ہرن کو تڑپتے دیکھ کر خوش ہو۔ کیسا بوکھلا رہا ہے، لیکن سورداس؟ آہ اس کی وہی حالت تھی جو کسی پاک باز عورت کی اپنی عصمت دری کے بعد ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر تک تینوں ساکت کھڑے رہے۔ بالآخر جگدھر نے کہا۔ ''سوبھاگی۔ اب تو کہاں جائے گی؟''

سوبھاگی نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''اپنے گھر جاؤں گی اور کہاں۔''

جگدھر: بگڑا ہوا ہے جان لے کر چھوڑے گا۔

سوبھاگی: چاہے مارے، چاہے جلائے۔ گھر تو میرا وہی ہے۔

جگدھر: کہیں اور کیوں نہیں پڑ رہتی؟ گسا (غصہ) اتر جائے تو چلی جانا۔

سوبھاگی: تمہارے گھر چلتی ہوں۔ رہنے دو گے؟

جگدھر: میرے گھر؟ مجھ سے تو وہ یونہی جلتا ہے پھر تو خون ہی کر ڈالے گا۔

سوبھاگی: تمہیں اپنی جان اتنی پیاری ہے تو دوسرا کون اس سے بیر مول لے گا۔

یہ کہہ کر سوبھاگی فوراً اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ سورداس نے ہاں نہیں کچھ نہ کیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد جگدھر بولا۔ ''سورداس تم آج میرے گھر چل کر سو رہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ بھیرو رات کو کوئی اپدرنہ مچائے۔ بدماس آدمی ہے۔ اس کا کون ٹھکانا؟ مار پیٹ کرنے لگے۔''

سورداس: بھیرو کو جتنا نادان سمجھتے ہو اتنا وہ نہیں ہے۔ تم سے کچھ نہ بولے گا۔ ہاں سوبھاگی کو جی بھر کے مارے گا۔

جگدھر: نسہ میں اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی۔

سورداس: میں کہتا ہوں تم سے کچھ نہ بولے گا۔ تم سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔ تم سے لڑائی کرنے کی اسے ہمت نہ پڑے گی۔

جگدھر کا خوف دور تو نہ ہوا مگر سورداس کی طرف سے نا امید ہو کر چلا گیا۔ سورداس ساری رات جاگتا رہا۔ اس بھاری الزام کے بعد اس کا اب وہاں رہنا شرمناک معلوم ہوتا تھا۔ اب منہ میں کالک لگا کر کہیں نکل جانے کے سوا اسے اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ ''میں نے تو کبھی کسی سے برائی نہیں کی۔ بھگوان مجھے کیوں یہ ڈنڈ دے رہے ہیں؟ یہ کن پاپوں کا پرائشچت کرنا پڑ رہا ہے؟ تیرتھ جاترا سے چاہے یہ پاپ اتر جائے۔ کل کہیں چل دینا چاہیے۔ پہلے بھی بھیرو نے مجھ پر یہی پاپ لگایا تھا۔ تب سارے محلّہ کے لوگ مجھے مانتے تھے۔ اس کی یہ بات ہنسی میں اڑ گئی۔ الٹے لوگوں نے اسی کو ڈانٹا۔ اب کی تو سارا محلّہ میرا دشمن ہے۔ لوگ سہج ہی میں بسواس کر لیں گے۔ منہ میں کالک لگ جائے گی۔ نہیں اب یہاں سے بھاگ جانے ہی میں کھیریت ہے۔ دیوتوں کی سرن لوں۔ وہی اب میری رچھا کر سکتے ہیں۔ پر بچاری سبھاگی کا کیا حال ہوگا؟ بھیرو اب کے اسے جرور چھوڑ دے گا۔ ادھر میں بھی چلا جاؤں گا تو بیچاری کیسے رہے گی؟ اس کے نیہر میں بھی تو کوئی نہیں ہے۔ جوان عورت ہے۔ محنت مجوری کر نہیں سکتی۔ نہ جانے کیسی پڑے کسی نہ پڑے۔ چل کر ایک بار بھیرو سے اکیلے میں ساری بات صاف صاف کہہ دوں۔ بھیرو سے میری کبھی صفائی

سے بات چیت نہیں ہوئی۔ اس کے من میں کانٹھ پڑی ہوئی ہے۔ من میں میل رہنے ہی سے اس کو میرے اوپر ایسا بھرم ہوتا ہے۔ جب تک اس کا من صاف نہ ہو جائے میرا یہاں سے جانا ٹھیک نہیں۔ لوگ کہیں گے کام کیا تھا تبھی کو ڈر کر بھاگا۔ نہ کرتا تو ڈرتا کیوں۔ یہ روپے بھی اسے پھیر دوں۔ مگر جو اس نے پوچھا کہ کہاں ملے تو؟ سوبھاگی کا نام نہ بتاؤں گا۔ کہہ دوں گا مجھے جھونپڑی میں رکھے ہوئے ملے۔ اتنا اچھپائے بنا سوبھاگی کی جان نہ بچے گی۔ لیکن پردہ رکھنے سے صفائی کیسے ہوگی؟ چھپائے کا کام نہیں ہے۔ سب کچھ پورا پورا سچ سچ کہہ دوں گا۔ تبھی اس کا من صاف ہوگا۔''

اس خیال سے اسے گونہ تشفی ہوئی جیسے شاعر کو الجھے ہوئے مضمون کے موزوں ہو جانے سے ہوا کرتی ہے۔ وہ تڑکے ہی اٹھا اور جا کر بھیرو کے دروازہ پر آواز دی۔ بھیرو سویا ہوا تھا پر سوبھاگی بیٹھی رو رہی تھی۔ بھیرو نے اس کے گھر پہنچتے ہی اس کی خوب زدوکوب کی تھی۔ سوبھاگی نے سورداس کی آواز پہچانی۔ چونکی کہ یہ اتنے تڑکے میں کیسے آ گیا۔ کہیں دونوں میں لڑائی نہ ہو جائے۔ سورداس کتنا طاقتور ہے یہ بات اس سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ ڈر گئی کہ سورداس رات کی باتوں کا بدلہ لینے نہ آیا ہو۔ یوں تو بڑا گم کھور ہے، پر آدمی ہی ہے گسا آ گیا ہوگا۔ جھوٹا الجام سن کر گسا آتا ہی ہے۔ کہیں گسے میں آ کر انہیں مار نہ بیٹھے۔ پکڑ پائے گا تو پران ہی لے کے چھوڑے گا۔ سوبھاگی بھیرو کی مار کھاتی تھی۔ گھر سے نکالی جاتی تھی لیکن یہ مجال نہ تھی کہ کوئی باہر کا آدمی بھیرو کو کچھ کہہ کر نکل جائے۔ اس کا منہ نوچ لیتی۔ اس نے بھیرو کو نہ جگایا۔ دروازہ کھول کر پوچھا کیا ہے۔ ''سورداس؟ کیا کہتے ہو؟''

سورداس کا دل بے اختیار چاہا کہ اس سے پوچھوں۔ رات کو تجھ پر کیا بیتی لیکن ضبط کر گیا۔ مجھے اس سے واسطہ؟ اس کی عورت ہے چاہے مارے چاہے رلاوے میں کون ہوتا ہوں پوچھنے والا؟ بولا۔ ''بھیرو کیا ابھی سوتے ہیں۔ جرا جگا دے۔ ان

سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

سوبھاگی: کون بات ہے؟ میں بھی سنوں۔

سورداس: ویسی ہی ایک بات ہے۔ جرا جگاتو دے۔

سوبھاگی: اس بکھت جاؤ۔ پھر کبھی آ کر کہہ دینا۔

سورداس: دوسرا کون بکھت آئے گا۔ میں سڑک پر جا بیٹھوں گا۔ انہیں بہت دیر نہ لگے گی۔

سوبھاگی: اور کبھی تو اتنے تڑکے نہ آتے تھے آج ایسی کون سی بات ہے؟

سورداس نے چڑ کر کہا۔ "اس سے کہوں گا تجھ سے کہنے والی بات نہیں ہے۔"

سوبھاگی کو یقین کامل ہو گیا کہ یہ اس وقت آپے میں نہیں ہے۔ ضرور مار پیٹ کرے گا۔ "مجھے مارا پیٹا تھوڑے ہی تھا۔ بس وہیں جو کچھ کہا سنا، وہی کہہ سن کر رہ گئے۔"

سورداس: چل تیرے چلانے کی آواز میں نے اپنے کانوں سنی۔

سوبھاگی: مارنے کو دھمکاتا تھا بس میں زور سے چلانے لگی۔

سورداس: نہ مارا ہوگا۔ مارتا بھی تو مجھے کیا۔ تو اس کی گھر والی ہے جو چاہے کرے۔ تو جا کرا سے بھیج دے۔ مجھے ایک بات کہنی ہے۔

اب بھی سوبھاگی نہ گئی تو سورداس نے بھیرو کا نام لے کر زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ کئی ہانکوں کے بعد بھیرو کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟ بیٹھو آتا ہوں۔"

سوبھاگی یہ سنتے ہی اندر گئی اور بولی۔ "جاتے ہو تو ایک ڈنڈا لیتے جاؤ۔ سورداس ہے۔ کہیں لڑنے نہ آیا ہو۔"

بھیرو: چل بیٹھ۔ لڑائی کرنے آیا ہے۔ مجھ سے تریا چرتر مت کھیل۔

سوبھاگی: مجھے اس کی تیوریاں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی سے کہتی ہوں۔

بھیرو: یہ کیوں نہیں کہتی کہ تو ہی اسے چڑھا کر لائی ہے۔ وہ تو اتنا کینہ نہیں رکھتا۔ اس کے من میں کبھی میل نہیں رہتا۔

یہ کہہ کر بھیرو نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور باہر آیا۔ اندھا شیر بھی ہو تو اس کا کیا خوف۔ اسے تو ایک بچہ بھی مار گرائے گا۔

سورداس نے بھیرو سے کہا۔ ''یہاں اور کوئی تو نہیں ہے۔ مجھے تم سے ایک بھید کی بات کہنی ہے۔''

بھیرو: کوئی نہیں ہے۔ کہو کیا کہتے ہو؟

سورداس: تمہارے چور کا پتہ چل گیا۔

بھیرو: سچ جوانی کی قسم؟

سورداس: ہاں۔ سچ کہتا ہوں۔ وہ میرے پاس آ کر تمہارے روپے رکھ گیا اور تو کوئی چیز نہیں گئی تھی!

بھیرو: مجھے جلانے آئے ہو۔ ابھی من نہیں بھرا؟

سورداس: نہیں بھگوان سے کہتا ہوں۔ تمہاری تھیلی میرے گھر میں جوں کی توں پڑی ملی۔

بھیرو: بڑا پاگل تھا پھر چوری کاہے کو کی تھی؟

سورداس: ہاں۔ پاگل ہی تھا اور کیا؟

بھیرو: کہاں ہے؟ ذرا دیکھوں تو۔

سورداس نے تھیلی کمر سے نکال کر بھیرو کو دکھائی۔ بھیرو نے لپک کر تھیلی لے لی۔ وہ جوں کی توں بند تھی۔

سورداس: گن لو۔ پورے ہیں کہ نہیں۔

بھیرو: ہیں! پورے ہیں۔ سچ بتاؤ کس نے چرایا تھا۔

بھیرو کو روپے ملنے کی اتنی خوشی نہ تھی جتنی چور کے نام معلوم کرنے کی خواہش۔ وہ

یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں نے جس پر شک کیا تھا وہی ہے یا کوئی اور۔

سورداس: نام جان کر کیا کرو گے۔ تمہیں اپنے مال سے مطلب ہے کہ چور کے نام سے۔

بھیرو: نہیں تمہیں کسم ہے بتا دو۔ ہے تو اسی محلّہ کا نا؟

سورداس: ہاں۔ ہے تو محلّہ ہی کا پر نام نہ بتاؤں گا۔

بھیرو: جوانی کی کسم میں اس سے کچھ نہ کہوں گا۔

سورداس: میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ نام نہ بتاؤں گا۔ نام بتا دوں اور تم بھی دنگا کرنے لگو تب؟

بھیرو: بسواس مانو۔ میں کسی سے نہ بولوں گا۔ جو کسم کہو کھا جاؤں اگر جبان (زبان) کھولوں تو سمجھ لینا کہ اس کی اصل میں پھرک (فرق) ہے۔ بات اور پاپ ایک ہے۔ اب اور کون کسم لینا چاہتے ہو؟

سورداس: اگر بات سے پھر گئے تو یہیں تمہارے دروا جے پر سر پٹک کر جان دے دوں گا۔

بھیرو: اپنی جان کیوں دو گے؟ میری جان لے لینا۔ چوں تک نہ کروں گا۔

سورداس: میرے گھر میں ایک بار چوری ہوئی تھی تمہیں یاد ہے نا؟ چور کو ایسا سجھا ہوا ہو گا کہ تم نے میرے روپے لیے ہیں۔ اسی سے اس نے تمہارے یہاں چوری کی اور مجھے روپے لا کر دے دیئے۔ بس اس نے میری گریبی پر دیا کی اور کچھ نہیں۔ اس سے میرا اور کوئی ناتا نہیں ہے۔

بھیرو: اچھا۔ یہ سب تو سن چکا نام تو بتاؤ۔

سورداس: دیکھو۔ تم نے کسم کھائی ہے۔

بھیرو: ہاں بھائی کسم سے پھرتا تھوڑے ہی ہوں۔

سورداس: تمہاری گھر والی اور میری بہن سو بھا گی۔

اتنا سننا تھا کہ بھیرو جیسے پاگل ہو گیا۔ گھر میں دوڑا ہوا گیا اور ماں سے بولا۔ ''اماں! اسی ڈائن نے میرے روپے چرائے تھے۔ سورداس اپنے منہ سے کہہ رہا ہے۔ اس طرح میرا گھر موس کر یہ چڑیل اپنے دھینگڑوں کا گھر بھرتی ہے۔ اس پر مجھ سے اوڑتی تھی۔ دیکھو تو تیری کیا گت بناتا ہوں۔ بتا سورداس جھوٹ کہتا ہے کہ سچ؟ سوبھاگی نے سر جھکا کر کہا۔ ''سورداس جھوٹ بولتے ہیں۔''

اس کے منہ سے بات پوری نہ نکلنے پائی کہ بھیرو نے لکڑی کھینچ کر ماری۔ وار خالی گیا اس سے بھیرو کا غصہ اور بھی بڑھا۔ وہ سوبھاگی کے پیچھے دوڑا۔ سوبھاگی نے ایک کوٹھڑی میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ بھیرو نے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ سارے محلّہ میں کہرام مچ گیا کہ بھیرو سوبھاگی کو مارے ڈالتا ہے۔ لوگ دوڑ پڑے۔ ٹھاکر دین نے اندر جا کر دریافت کیا۔ ''کیا ہے بھیرو کیوں کواڑ توڑے ڈالتے ہو؟ بھلے آدمی کوئی گھر کے آدمی پر اتنا گسا کرتا ہے۔''

بھیرو: کیسا گھر کا آدمی جی۔ ایسے گھر کے آدمی کا سر کاٹ لینا چاہیے جو دوسروں سے ہنسی دل لگی کرے۔ آخر میں کانا ہوں، کترا ہوں، لنگڑا ہوں، لولا ہوں مجھ میں کیا عیب ہے جو یہ دوسروں سے ہنسی دل لگی کرتی ہے۔ میں اس کی ناک کاٹ کر تبھی چھوڑوں گا۔ میرے گھر جو چوری ہوئی تھی وہ اسی چڑیل کی کرتوت تھی۔ اسی نے روپے چرا کر سورداس کو دیئے تھے۔

ٹھاکر دین: سورداس کو؟

بھیرو: ہاں ہاں سورداس کو۔ باہر تو کھڑا ہے۔ پوچھتے کیوں نہیں؟ اس نے جب دیکھا کہ اب چوری نہ بچے گی تو لا کر سب روپے مجھے دے گیا ہے۔

بجرنگی: اچھا تو روپے سوبھاگی نے چرائے تھے!

لوگوں نے بھیرو کو ٹھنڈا کیا اور باہر کھینچ لائے۔ یہاں سورداس پر رائے زنی ہونے لگی۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ صاف صاف کہے۔ سب کے سب ڈر رہے تھے کہ

کہیں میم صاحب سے شکایت نہ کر دے۔ مگر کنایتاً سبھی اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ سورداس کو آج معلوم ہوا کہ پہلے کوئی مجھ سے ڈرتا نہ تھا پر دل میں سب عزت کرتے تھے۔ اب سب کے سب مجھ سے ڈرتے ہیں پر میری سچی عزت کسی کے دل میں نہیں ہے۔ اسے اتنی ندامت تھی کہ وہ چاہتا تھا آسمان سے بجلی گرے اور میں یہیں جل بھن جاؤں۔

ٹھاکر دین نے آہستہ سے کہا۔ ''سورداس تو کبھی ایسا نہ تھا۔ آج سے نہیں لڑکپن سے دیکھتے ہیں۔''

نایک رام: پہلے نہیں تھا اب ہو گیا ہے۔ اب تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔

ٹھاکر دین: کوئی بل پا کر تو سبھی کو گھمنڈ ہو جاتا ہے پر سورداس میں تو مجھے کوئی ایسی بات نہیں دکھائی دی۔

نایک رام: چھپا رستم ہے۔ بجرنگی! مجھے تمہارے اوپر سک تھا۔

بجرنگی: (ہنس کر) پنڈا جی۔ بھوان سے کہتا ہوں کہ مجھے تمہارے اوپر سک تھا۔

بھیرو: اور مجھ سے جو سچ پوچھو تو جگدھر پر سک تھا۔

سورداس سر جھکائے چاروں طرف کے طعنے سن رہا تھا۔ پچھتا رہا تھا کہ میں نے ایسے نیچ آدمی سے یہ بات کہی کیوں۔ میں نے تو سمجھا تھا صاف صاف کہہ دینے سے اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ اس کا یہ پھل ملا! میرے منہ میں تو کالکھ لگ ہی گئی۔ اس بیچاری کا نہ جانے کیا حال ہو گا۔ بھگوان اب کہاں گئے؟ کیا کتھا پورانوں ہی میں اپنے سیوکوں کو ابارنے آتے تھے؟ اب کیوں نہیں آکاس سے کوئی دوت آکر کہتا کہ اندھا بے قصور ہے؟

جب بھیرو کے دروازہ پر یہ تماشا ہوتے ہوئے نصف گھنٹہ سے زیادہ ہو گیا تو سورداس کے صبر کا پیالہ چھلک پڑا۔ اب چپ رہنا اس کے خیال میں بزدلی تھی۔ کمنہ پن تھا ایک پاک صاف عورت پر اتنا کلنک تھوپا جا رہا ہے اور میں چپ چاپ

کھڑا کھڑا سنتا ہوں۔ یہ مہاپاپ ہے۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور پھٹی ہوئی آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ''یارو! کیوں بپت کے مارے ہوئے دکھیا پر یہ کیچڑ پھینک رہے ہو؟ کچھ تو بھگوان سے ڈرو۔ کیا سنسار میں کہیں نیائے نہیں رہا؟ میں نے تو بھلی منسی کی کہ بھیرو کے روپے اسے لوٹا دیئے۔ اس کا مجھے یہ پھل مل رہا ہے! سوبھاگی نے یہ کام کیوں کیا اور کیوں یہ روپے مجھے دیئے۔ یہ میں نہ بتاؤں گا، لیکن بھگوان میری اس میں بھی جیادرگت کریں اگر میں نے سوبھاگی کو اپنی چھوٹی بہن کے سوا کبھی کچھ سمجھا ہو۔ میرا اپرادھ اتنا ہی ہے کہ وہ رات کو میری جھونپڑی میں آئی تھی۔ اس وقت جگدھر وہاں بیٹھا تھا۔ اس سے پوچھو کہ ہم لوگوں میں کون سی باتیں ہو رہی تھیں۔ اب اس محلّہ میں مجھ جیسے اندھے اپاہج کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ جاتا ہوں پر اتنا کہے جاتا ہوں کہ سوبھاگی پر جو کلنک لگائے گا اس کا بھلا نہ ہو گا۔ وہ پاک صاف ہے۔ اسے پاپ لگا کر کوئی سکھ کی نیند نہیں سو سکتا۔ میرا کون رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے دروازے کھڑا ہو جاؤں گا وہی ایک چٹکی آٹا دے گا۔ اب یہاں سے دانہ پانی اٹھتا ہے پر ایک دن آوے گا جب تم لوگوں کو ساری باتیں معلوم ہو جائیں گے اور تب تم جانو گے کہ اندھا بے قصور تھا۔

یہ کہہ کر سورداس اپنی جھونپڑی کی طرف چلا گیا۔

(24)

سورداس کی زمین واپس دلا دینے کے بعد صوفیہ پھر مسٹر کلارک سے کھنچ گئی۔ دن گزرتے جاتے تھے اور وہ مسٹر کلارک سے دور تر ہوتی جاتی تھی۔ اس کو اب اپنی سچی محبت کے لیے ذلیل و رسوا ہونے کی بہ نسبت مصنوعی محبت کا سوانگ بھرنا کہیں زیادہ ناقابل برداشت معلوم ہوتا تھا۔ سوچتی تھی کہ میں پانی سے بچنے کے لیے آگ میں کود پڑی۔ فطرت پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے اپنے دل کو جبراً ونے کی طرف سے ہٹانا چاہا تھا۔ اب وہی دل بڑی تیزی کے ساتھ ان کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس طرف

اس نے بھگتی (زہد) کے متعلق چند کتابیں پڑھی تھیں اور نتیجہ یہ تھا کہ اس کے خیالات میں ایک تغیر ہو گیا تھا۔ ذلت و بدنامی کا خوف اس کے دل سے مٹنے لگا تھا۔ اس کے سامنے محبت کا بلند ترین معیار تھا۔ جہاں خودی کی آواز نہیں پہنچتی۔ زاہد خشک نے بادۂ احمر کا مزہ پالیا تھا اور نشہ میں اب اس کو دنیاوی عیش و آرام، عزت و فضیلت سب ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ جن خیالات سے متاثر ہو کر اس نے ونے سے محترز رہنے اور کلارک سے عقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ اب اس کو سراسر غیر فطری معلوم ہوتے تھے۔ رانی جانہوی کے ہاتھوں ذلیل ہو کر اپنے نفس کی تنبیہ کے لیے اس نے اپنے اوپر یہ ظلم گوارا کیا تھا۔ مگر اب اس کو یہی نہ معلوم ہوتا تھا کہ میرے اطوار میں خرابی کی کون سی بات تھی۔ اس میں ناموزونیت کیا تھی؟ اس کا دل اب اس فیصلہ کی سخت مخالفت کر رہا تھا۔ وہ خود اس فیصلہ کو قابل نفرت سمجھ رہی تھی۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ میں نے ونے کی جگہ پر کلارک کو لا بٹھانے کا فیصلہ کیونکر کیا؟ مسٹر کلارک میں ذاتی اوصاف کی کمی نہیں۔ وہ قابل ہیں۔ شریف ہیں۔ فیاض ہیں۔ نیک دل ہیں۔ وہ کسی ایسی عورت کو خوش خرم رکھ سکتے ہیں جسے دنیاوی عیش و آرام کی تمنا ہو، لیکن ان میں وہ ایثار کہاں۔ وہ خدمت کا جذبہ کہاں۔ وہ زندگی کا اونچا معیار کہاں۔ وہ مردانہ عہد کہاں۔ وہ شوق شہادت کہاں؟ اسے اب محبت کی داستانیں اور صوفیانہ رنگ کی نظمیں، جیو اور آتما، حادث و قدیم، تناسخ اور سخاوت وغیرہ وغیرہ ادق مسائل کی توضیح و تشریح کے مقابلہ میں زیادہ دل کش معلوم ہوتی تھیں۔ اسی درمیان میں اسے کرشن کے سوانحی حالات مطالعہ کرنے کا موقع ملا جس نے اس اعتقاد کی جڑ ہلا دی جو اسے حضرت عیسیٰ پر تھا۔ وہ دل میں دونوں کا موازنہ کرتی۔ مسیح کے رحم کی بہ نسبت اسے کرشن کی محبت سے زیادہ تسکین ہوتی تھی۔ اس نے اب تک گیتا ہی کے کرشن کو دیکھا تھا اور مسیح دیا، خدمت اور پاکیزگی کے سامنے اسے کرشن کی پراسرار زندگی گیتا کی مشکل فلسفیانہ تشریحات سے بھی زیادہ ناقابل فہم معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سر گیتا

کے اعلیٰ تخیل کے سامنے جھک جاتا تھا۔ مگر اس سے دل میں بھگتی کا جذبہ نہ پیدا ہوا تھا۔ کرشن کی طفلانہ زندگی کو اس نے عقیدت مندوں کی فرضی بات سمجھ رکھا تھا اور اس پر غور کرنا ہی فضول سمجھتی تھی۔ لیکن اب عیسیٰ کا رحم کرشن کے طفلانہ کھیلوں کے سامنے بالکل خشک سا معلوم ہوتا تھا۔ عیسیٰ کے رحم میں روحانیت تھی۔ کرشن کی محبت میں جذبہ تھا۔ عیسیٰ کا رحم آسمان کی طرح غیر محدود تھا۔ کرشن کی محبت ایک نوشگفتہ باغ کی طرح دلفریب تھی۔ عیسیٰ کا رحم دریا کا نغمۂ شیریں تھا۔ کرشن کی محبت بنسی کی صبر آزما آواز۔ ایک فرشتہ تھا۔ دوسرا انسان۔ ایک زاہد تھا۔ دوسرا شاعر۔ ایک میں بیداری اور دانائی تھی۔ دوسرے میں رنگینی و دیوانگی۔ ایک تاجر تھا، نفع و نقصان پر نگاہ رکھنے والا۔ دوسرا شوقین تھا، اپنے نقد و جنس کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے والا۔ ایک محتاط تھا تو دوسرا آلودہ۔ اب صوفیہ کا دل ہمیشہ اسی محبت کے کھیل میں محو رہتا تھا۔ کرشن نے اسے فریفتہ کر لیا تھا۔ اسے اپنی بنسی کی صدا سنا دی تھی۔

مسٹر کلارک کی دلجوئیاں اب اسے مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری محبت آفرینیاں ایک آزمائش کی تاب بھی نہیں لا سکتیں۔ وہ اکثر ان سے بے اعتنائی برتتی۔ وہ باہر سے مسکراتے ہوئے آ کر اس کی بغل میں کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتے اور یہ ان کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ یہاں تک کہ کئی بار اس نے اپنی مذہبی بد اعتقادیوں سے مسٹر کلارک کے مذہبی دل کو سخت صدمہ پہنچایا۔ انہیں صوفیہ ایک معما سی معلوم ہوتی تھی جسے سمجھنے سے وہ قاصر تھے۔ اس کا بے مثال حسن۔ اس کا دلفریب انداز۔ اس کی غیر معمولی ذہانت۔ جتنے زور سے اپنی طرف کھینچتی تھیں اتنا ہی اس کی تمکنت۔ آزاد خیالی اور بے باکی انہیں خائف کر دیتی تھیں۔ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے وہ اپنی پستی کو محسوس کرتے تھے اور لمحہ بہ لمحہ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے اتنی بے تکلفی کے باوجود بھی انہیں اس سے شادی کا وعدہ لینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مسز سیوک آگ میں

ایندھن ڈالتی رہتی تھیں۔ ایک طرف کلارک کو اکساتیں۔ دوسری طرف صوفی کو سمجھاتیں ''تو سمجھتی ہے کہ زندگی میں ایسے موقعے بار بار آتے ہیں مگر یہ تیری غلطی ہے۔ انسان کو صرف ایک موقع ملتا ہے اور وہی اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔''

مسٹر جان سیوک نے بھی اپنے پدر بزرگوار کے حسب الحکم دورخی چال چلنا شروع کر دی۔ وہ پوشیدہ طور سے تو راجہ مہیندر کمار کی کل گھماتے رہتے مگر ظاہر میں مسٹر کلارک کی خاطر و مدارت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ رہے مسٹر ایشور سیوک۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ خدا نے صوفیہ کو مسٹر کلارک ہی کے لیے بنایا ہے۔ یہ اکثر ان کے یہاں جاتے تھے اور وہیں کھانا بھی کھا لیتے تھے۔ جیسے کوئی دلال گاہک کو دیکھ کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے اور اسے کسی دوسری دکان پر بیٹھنے نہیں دیتا ویسے ہی وہ مسٹر کلارک کو گھیرے رہتے تھے کہ کوئی اونچی دکان انہیں متوجہ نہ کرے۔ مگر اتنے خیر خواہوں کے رہتے ہوئے بھی مسٹر کلارک کو اپنی کامیابی مشکل معلوم ہوتی تھی۔

صوفیہ کو ان دنوں بناؤ سنگار کا بڑا شوق ہو گیا تھا۔ اب تک اس نے مانگ چوٹی یا زیور اور لباس کی کبھی پروا نہ کی تھی۔ تن آسانیوں سے دور رہنا چاہتی تھی۔ مذہبی کتب کی یہی تعلیم تھی کہ جسم فانی ہے اور دنیا بے ثبات اور زندگی سراب کی طرح ہے۔ پس اس کے لیے آلائش و زیبائش کی ضرورت نہیں۔ اصلی آرائش کچھ اور ہی ہے۔ اسی پر نگاہ رکھنی چاہیے، لیکن اب وہ زندگی کو اس قدر حقیر نہ سمجھتی تھی۔ اس کے حسن میں کبھی اتنی شان رعنائی نہ تھی۔ وہ بننے ٹھننے کے لیے کبھی اتنی بے قرار نہ تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ سورج کی ٹھنڈی کرنیں کسی دیوتا کی دعا کی طرح نا نہالان باغ کے دلوں کو شگفتہ کر رہی تھیں۔ صوفیہ ایک کنج میں کھڑی خود بخود مسکرا رہی تھی کہ مسٹر کلارک کی موٹر آ پہنچی۔ وہ صوفیہ کو باغ میں دیکھ کر سیدھے اس کے پاس گئے اور ایک التفات طلب نظر سے دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صوفیہ نے منہ پھیر لیا۔

گویا اس نے ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا نہیں۔

یکا یک ایک لمحہ کے بعد صوفیہ نے تمسخر کے انداز سے پوچھا۔ ''آج کتنے مجرموں کو سزا دی؟''

مسٹر کلارک خفیف ہوئے، رکتے ہوئے ''پیاری یہ تو روز کی باتیں ہیں۔ ان کا کیا چرچا کروں؟''

صوفیہ: تم یہ کیسے تحقیق کرتے ہو کہ فلاں مجرم ہی دراصل مجرم ہے؟ اس کا تمہارے پاس کوئی آلہ ہے؟

کلارک: گواہ تو رہتے ہیں۔

صوفیہ: گواہ ہمیشہ سچے ہوتے ہیں؟

کلارک: ہرگز نہیں۔ گواہ اکثر جھوٹے اور سکھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

صوفیہ: اور انہیں گواہوں کے بیان پر فیصلہ کرتے ہو۔

کلارک: اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے؟

صوفیہ: تمہاری بے چارگی دوسروں کی جان کیوں عذاب میں ڈالے؟ اس لیے کہ تمہارے واسطے موٹر کار، بنگلہ، خانسامے، طرح طرح کی شرابیں اور تفریح کے دیگر سازوسامان مہیا کیے جائیں۔

کلارک نے خفیف آمیز لہجہ میں کہا۔ ''تو کیا ملازمت سے استعفیٰ دے دوں؟''

صوفیہ: جب تم جانتے ہو کہ موجودہ طرز حکومت میں اتنی خامیاں ہیں تو تم اس کا ایک رکن بن کر بے گناہوں کا خون کیوں کرتے ہو؟

کلارک: پیاری میں نے اس بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔

صوفیہ: اور بلا غور کیے ہی روز انصاف کا خون کیا کرتے ہو۔ کتنے بے درد ہو!

کلارک: ہم تو صرف ایک مشین کے پرزہ ہیں ہمیں اتنا سوچنے سے کیا مطلب؟

صوفیہ: کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا؟

کلارک: ایسا دعویٰ کوئی انسان نہیں کرسکتا۔

صوفیہ: تو تم اس لیے سزا سے بچے ہوئے ہو کہ تمہارے جرم پوشیدہ ہیں؟

کلارک: ایسا قبول کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر مجبوراً قبول کرنا ہی پڑے گا۔

صوفیہ: تعجب ہے کہ خود مجرم ہو کر تمہیں دیگر مجرموں کو سزا دیتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی؟

کلارک: صوفیہ! اس کے لیے تم پھر کبھی میری توہین کر لینا۔ اس وقت مجھے ایک خاص معاملہ میں تم سے صلاح لینی ہے۔ خوب سوچ کر رائے دینا۔ راجہ مہیندر کمار نے میرے فیصلہ کی اپیل گورنر کے یہاں کی تھی۔ اس کا ذکر تو میں تم سے کر ہی چکا ہوں۔ اس وقت میں نے سمجھا تھا گورنر اپیل پر توجہ نہ دیں گے۔ ایک حاکم ضلع کے خلاف کسی رئیس کی مدد کرنا ہمارے طرز حکومت کے خلاف ہے کیونکہ اس سے حکومت میں خلل آتا ہے، لیکن چھ سات مہینوں میں واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی ہے اور راجہ صاحب نے اپنی خاندانی عزت، مستقل ارادہ اور استدلالی قوت سے ایسی اچھی طرح کام لیا ہے کہ اب گورنر کا فیصلہ شاید میرے خلاف ہوگا۔ کونسل میں ہندوستانیوں کی کثرت ہو جانے کے باعث اب گورنر کی ذاتی رائے کی اہمیت بہت کم ہوگئی۔ اگرچہ وہ کونسل کے فیصلہ کو مسترد کر سکتے ہیں۔ مگر اس اختیار سے وہ خاص حالتوں ہی میں مدد لے سکتے ہیں۔ اگر راجہ صاحب کی اپیل واپس کر دی گئی تو دوسرے روز ملک بھر میں کہرام مچ جائے گا اور اخبارات کو غیر ملکی حکومت کے ایک نئے ظلم پر شور مچانے کا وہ موقع مل جائے گا جسے وہ روز کھوجتے رہتے ہیں۔ اس لیے گورنر نے مجھ سے پوچھا ہے کہ اگر راجہ صاحب کی اشک شوئی کر دی جائے تو تمہیں کچھ ملال تو نہ ہوگا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا جواب دوں۔ ابھی تک کوئی رائے قائم نہیں کر سکا۔

صوفیہ: کیا رائے قائم کرنا اتنا مشکل ہے؟

کلارک: ہاں۔ اس لیے مشکل ہے کہ رائے عامہ سے حکومت کرنے کا جو بندوبست ہم لوگوں نے خود ہی کیا ہے اسے پیروں تلے کچلنا برا معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ کتنا ہی طاقت ور ہو، لیکن انصاف کا پردہ رکھنے کے لیے کبھی کبھی اسے بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ میرے لیے کوئی بات نہیں۔ فیصلہ میرے موافق ہو یا خلاف۔ میرے اوپر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ رعایا پر ہمارے انصاف کی دھاک اور بیٹھی جاتی ہے (مسکرا کر) گورنر نے مجھے اس جرم کے لیے سزا بھی دی ہے۔ وہ مجھے یہاں سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔

صوفیہ: کیا تمہیں اتنا دبنا پڑے گا؟

کلارک: ہاں۔ میں ایک ریاست کا **پولیٹکل** ایجنٹ بنا دیا جاؤں گا۔ یہ عہدہ بڑے مزہ کا ہے۔ راجہ تو صرف نام کے لیے ہوتا ہے۔ پورا اختیار ایجنٹ ہی کو رہتا ہے۔ ہم لوگوں میں جو بڑے خوش نصیب ہیں انہیں کو یہ منصب ملتا ہے۔

صوفیہ: تب تو تم بڑے خوش نصیب ہو۔

مسٹر کلارک اس طنز سے دل ہی میں کڑھ کر رہ گئے۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ صوفیہ یہ خبر سن کر پھولی نہ سمائے گی اور جبھی مجھے یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ کہاں سے جانے سے پہلے ہمارا عقد ہو جانا ضروری ہے۔ ''تب تو تم بڑے خوش نصیب ہو۔'' اس بے دردانہ طنز نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس جملہ میں وہ مغائرت، وہ طنز، وہ بے اعتنائی بھری ہوئی تھی، جو دوستانہ دلجوئی کی بھی پروا نہیں کرتی۔ وہ سوچنے لگے کہ اس کی رائے کا انتظار کیے بغیر ہی میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ کہیں یہی بات تو اسے بری نہیں لگی؟ شاید سمجھتی ہو کہ یہ اپنے ذاتی فائدہ سے اتنا خوش ہو رہے ہیں مگر اس بیکس اندھے کی انہیں ذرا بھی پروا نہیں کہ اس پر کیا گزرے گی۔ اگر یہی کرنا تھا تو یہ راگ ہی کیوں چھیڑا تھا۔ یہ سوچ کر وہ بولے۔ ''یہ تمہارے فیصلہ پر منحصر ہے۔''

صوفیہ نے بے تعلقی سے جواب دیا۔ ''ان معاملات میں تم مجھ سے زیادہ ہوشیار ہو۔''

کلارک: اس اندھے کا خیال ہے۔

صوفیہ نے بے رحمی سے کہا۔ ''اس اندھے کے خدا تمہی نہیں ہو۔''

کلارک: میں تم سے صلاح پوچھتا ہوں اور تم مجھی پر چھوڑتی جاتی ہو۔

صوفیہ: اگر میری صلاح سے تمہارا نقصان ہو تو؟

کلارک نے دلیری سے جواب دیا۔ ''صوفیہ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔''

صوفیہ: (ہنس کر) اس کے لیے میں تمہاری ممنون ہوں۔

اسی اثنا میں مسز سیوک وہاں آ گئیں اور کلارک سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں۔ صوفیہ نے دیکھا اب مسٹر کلارک کو بنانے کا موقع نہیں رہا تو اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ دیکھا تو پربھوسیوک وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ صوفیہ نے کہا۔ ''ان حضرت کو اب یہاں سے بوریا بندھنا سنبھالنا پڑے گا۔ ریاست کے ایجنٹ ہوں گے۔''

پربھوسیوک: (چونک کر) کب؟

صوفیہ: بہت جلد راجہ مہیندر کمار انہیں لے بیٹھے۔

پربھوسیوک: تب تو تم بھی یہاں تھوڑے ہی دنوں کی مہمان ہو۔

صوفیہ: میں ان سے شادی نہ کروں گی۔

پربھوسیوک: سچ؟

صوفیہ: ہاں میں کئی دن سے فیصلہ کر چکی ہوں پر تم سے کہنے کا موقع نہیں ملا۔

پربھوسیوک: کیا ڈرتی تھیں کہ کہیں میں شور نہ مچا دوں؟

صوفیہ: بات تو واقعی ہی تھی۔

پربھوسیوک: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ پر اس قدر بے اعتباری کیوں کرتی

ہو؟ جہاں تک یاد ہے میں نے تمہاری بات کسی نے نہیں کہی۔

صوفیہ: معاف کرنا پربھو۔ نہ جانے کیوں مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہوتا۔ تم میں ابھی کچھ لڑکپن ہے۔ کچھ ایسے کھلے ہوئے بے فکر آدمی ہو کہ میں تم سے کوئی بات کہتے اسی طرح ڈرتی ہوں جیسے کوئی شخص درخت کی نازک شاخ پر پیر رکھتے ڈرتا ہے۔

پربھوسیوک: اچھی بات ہے۔ یونہی مجھ سے ڈرا کرو۔ واقعی میں کوئی بات سن لیتا ہوں تو میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے ہیں اور جب تک کسی سے کہہ نہ دوں مجھے چین نہیں آتا۔ خیر میں تمہیں اس فیصلہ پر مبارک باد دیتا ہوں۔ میں نے تم سے صاف طور پر تو کبھی نہیں کہا مگر کئی بار کنایتاً کہہ چکا ہوں کہ مجھے کسی حالت میں کلارک کو اپنا بہنوئی بنانا پسند نہیں ہے۔ مجھے جانے کیوں ان سے چڑ ہے۔ وہ بیچارے میری بہت خاطر کرتے ہیں مگر میرا جی ان سے نہیں ملتا۔ ایک بار میں نے ان کو اپنی نظم سنائی تھی۔ اسی دن سے مجھے ان سے چڑ ہو گئی ہے، بیٹھے سونٹھ بنے سنتے رہے۔ انہیں دیکھ کر بس یہی دل میں آتا ہے کہ خوب بناؤں۔ میں نے کتنے ہی لوگوں کو اپنا کلام سنایا ہوگا مگر وہ نے جیسا سخن شناس کوئی نہ ملا۔ اگر وہ کچھ لکھیں تو خوب لکھیں۔ شعریت گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔

صوفیہ: تم ادھر کبھی کنور صاحب کی طرف نہیں گئے تھے؟

پربھوسیوک: آج گیا تھا اور وہیں سے چلا آ رہا ہوں۔ وہ نے سنگھ بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ اودے پور کے حاکموں نے انہیں جیل میں ڈال رکھا ہے۔

صوفیہ کے چہرہ پر غصہ یا رنج کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ اس نے یہ نہ پوچھا کہ کیوں گرفتار ہوئے؟ کیا قصور تھا؟ یہ ساری باتیں ان سے اٹکل سے معلوم کر لیں صرف اتنا پوچھا۔ ''رانی صاحبہ تو وہاں نہیں جا رہی ہیں؟''

پربھوسیوک: نہیں کنور صاحب اور ڈاکٹر گنگولی دونوں جانے کو تیار ہیں مگر رانی کسی